Vol. 7 No.3 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

مجید امجد کی نظموں میں صنعتی دور کے فرد کی نفسیات

ثمرہ حسین
پی ایچ ڈی اسکالر، لاہور لیڈز یونی ورسٹی، لاہور
کشف افتخار بھٹی
پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی یو لاہور
فرزانہ افضال
پی ایچ ڈی اسکالر، لاہور لیڈز یونی ورسٹی، لاہور

Abstract:

On the whole, Majeed Amjad's poems are unique because of their concepts. He has neither imitated anyone nor encouraged anyone to imitate him. His poetry is not reserved for any particular class, but its scope is so wide that it includes animals, plants, flowers, fruits, earth, insects, and children. He has even incorporated life and death into his poetry. His subjects are truly original. Majid Amjad is a poet with a unique voice, as the themes he incorporates into his poetry reflect every aspect of the modern industrial age. He also sheds light on the psychology of humans in this era. His poems reveal glimpses of the relationship between nature and humanity, which he portrays in both innocent and harsh ways.

Keywords: Majeed Amjad's poems, Modern industrial age, Incorporated life. Modern industrial age, unique

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے درمیانی عرصہ میں زندگی کے تمام شعبوں میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں رونما ہوئیں ۔ جس میں کان کنی، زراعت، مواصلات ذرائع معاش اور معاشرتی تبدیلیوں کا سبب بنا۔ یہ تبدیلیاں قوت کے ساتھ ساتھ پوری دنیا میں پھیل گئیں۔ اس انقلاب نے انسانی زندگی میں نئے باب کا آغاز کیا۔ جس کے تحت نئی اور مثبت تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں مشینوں نے انسانوں اور جانوروں کی مشقت کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ پہلے کپڑے اور پھر لوہے کی صنعت میں ترقی ہوئی اس وجہ سے کوئلے کی مانگ میں بھی اضافہ ہوا۔ بھاپ سے چلنے والا انجن بھی کوئلے کی مدد سے چلایا جاتا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں بھاپ سے چلنے والا انجن عظیم مشینی ایجاد ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں دھات کے حوالے سے کی جانے والی تحقیقات سے مشین سازی کی صنعت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ کپڑے اور لوہے کی صنعت کے علاوہ دیگر صنعتیں بھی وجود میں آنے لگیں۔ دنیا میں ہونے والے صنعتی انقلاب سے ہندوستان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال پر قبضے کے بعد کلکتہ میں پہلی ٹیکسٹائل مل لگائی۔ بمبئی اور گجرات پر قبضے کے بعد یہاں بھی صنعتیں لگائی جانے لگیں۔ تجارتی امور کو سرانجام دینے کے لیے بنگال ریلوے بنائی گئی۔

صنعتی ترقی کے لیے مثبت اور منفی دونوں پہلو ایک ساتھ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ صنعتی ترقی اور نئی دنیا کا خواب دیکھنا ایک الگ بات تھی مگر اس کو حقیقت میں تسلیم کرنا ترقی یافتہ ممالک کے لیے بھی اتنا ہی دشوار تھا جتنا کہ پسماندہ معاشروں کے لئے۔ صنعتی ترقی کے باعث فطری زندگی کی شکل بگڑ کر رہ گئی۔ اس ترقی کے باعث فرد کے مفادات کو نظرانداز کر کے اس کی جگہ معاشروں اور قوم کو دے دی گئی۔ مشینوں کی اس دنیا میں انسان کی حیثیت ایک حساس مشین کی سی نظر آنے لگی۔ انسان کی عظمت، سخاوت، نیکیاور حسن سلوک جیسی صلاحیتیں زندگی سے اوجھل ہوتی ہوئی دکھائی دینے لگیں۔

Vol. 7 No.3 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

"طلوع فرض" نظم مجید امجد کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے۔اس نظم میں زندگی کے معاشی معاملات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔اس سے معاشرے کے ایک خاص طبقے کی نفسیات ظاہر ہوتی ہے۔ صنعتی دور کی مشینی زندگی سے بے کلی اور بیزاری کا احساس ملتا ہے۔ مثلاوہ کہتا ہے:

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں، ہمرہِ صد کارواں ہوں
سرِ بازار انسانوں کا انبوہ،
کسی دست گل اندوزِ حنا میں
زمانے کی حسیں رتھ کی لگامیں
کسی کف پر خراشِ خارِ محنت،
عدم کے راستے پر آنکھ میچے

کوئی آگے رواں ہے کوئی پیچھے(۱)

یہاں مجید امجد زندگی کی مسلسل ایک ہی طرح کی مصروفیت سے بیزار نظر آتے ہیں۔ مثلا ہم صبح جاگتے ہیں، دفتر یا سکول جاتے ہیں، زندگی کی ضروریات نے ہمیں کسی مشین کی طرح مسلسل مصروف عمل کر رکھا ہے یہ المیہ صنعتی دور کے تمام انسانوں کا ہے۔انسان کاروباری زندگی میں ایسا الجھا ہے کہ اپنے وجود اور فطرت کے نظاروں سے بیگانہ ہو گیا ہے۔اپنے وجود کو پس پشت ڈال کر آسائشوں کی خاطر سعی لاحاصل سے دوچار ہے وہ انہی الجھنوں میں وجود سے عدم کے سفر کی طرف رواں ہے۔اسی نظم میں وہ آگے چل کر کہتے ہیں:

ابھی کمسن ہے اس کو کیا پڑی ہے
جسے جزداں بھی اک بارِ گراں ہے
وہ بچہ بھی سُوئے مکتب رواں ہے
شریکِ کاروانِ زندگانی
یہ کیا ہے مالکِ زندانِ تقدیر
جوان و پیر کے پاؤں میں زنجیر(۲)

نظم کے اس حصے میں مجید امجد نے یہ بات واضح کی ہے کہ صنعتی دور نے نا صرف نوجوانوں اور بوڑھوں کو اپنی زد میں لیا ہے بلکہ بچے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔اچھے مستقبل کی خاطر والدین اپنے کم سن بچوں کو کتابوں کے بوجھ تلے دبا کر مکتب کی طرف روانہ کرتے ہیں۔تاکہ وہ زندگی کے اس کارواں میں کسی سے پیچھے نا رہ جائیں ۔جبکہ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ کاتب تقدیر نے ہر کسی کے پاوں میں محنت کی زنجیر باندھ رکھی ہے۔ محنت کی لیے عمر کی کوئی تخصیص نہیں اسی وجہ سے صنعتی دور کا ہر فرد وہ بچہ ،بوڑھا یا جوان ہو کسی نا کسی الجھن میں دکھائی دیتا ہے۔اسے اس بات کا فکر رہتی ہے کہ آنے والا وقت کیسے کٹے گا ۔آسائشوں کی دھن میں وہ صبح و شام سے بے خبر دوڑتا چلا جاتا ہے۔اور یوں اس کا دن مصروفیت میں ڈھل جاتا ہے اور پھر یک نئی سحر اسے صنعتی دور کے کارواں کا راہی بنا دیتی ہے۔ سحر اسی فکر میں ہوتی ہے کہ کام کو کیسے مکمل کیا جائے۔

Vol. 7 No.3 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

مجید امجد کی نظم ایکسیڈنٹ صنعتی دور کے فرد کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ صنعتی دور کا فرد جہاں حساس ہے وہیں بے حس بھی ہے۔ حساس اس صورت میں کہ وہ سڑک پر ایک ایکسیڈنٹ دیکھتا ہے جو اس کے ذہن پر دیر پا نقوش چھوڑ دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ شخص جب بھی اس سڑک سے گزرتا ہے، اسے محسوس ہوتا ہے کہ خون کا وہ دھبہ اس سے سوال کرتا ہے۔ جیسے:

مجھ سے روز یہی کہتا ہے پکی سڑک پر وہ کالا سا داغ جو کچھ دن پہلے
سرخ لہو کا تھا اک چھینٹا چکنا گیلا چمکیلا
مٹی اس پہ گری اور میلی سی اک پپڑھی اس پر سے اتری
اور پھر سیندوری سا اک خاکہ ابھرا
جواب پکی سڑک پر کالا سا دھبہ ہے
پسی ہوئی بجری میں جذب اور جامد ان مٹ
مجھ سے روز یہی کہتا ہے پکی سڑک پر مسلا ہوا وہ داغ لہو کا(۳)

شاعر کو سڑک پر موجود وہ دھبہ بچہ محسوس ہوتا ہے جو اس سے کہہ رہا ہے کہ میں نے تو پہلی دفعہ اپنی اچھلتی ہوئی گیند کے پیچھے چھلانگ لگائی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھ پر منوں مٹی ڈال دی گئی۔ میں نے ابھی دنیا کے بہت سے تعمیری کاموں میں حصہ لینا تھا، ابھی میں کلی کی صورت میں تھا جسے کھلنا تھا، میں نے سورج بن کر چمکنا تھا لیکن میرے چمکنے سے پہلے ہی مجھے اندھیروں کے سپرد کر دیا گیا۔ شاعر نے جہاں صنعتی دور کی الجھنوں میں شکار فرد میں موجود حساس پہلو کو بیان کیا ہے اسی طرح نہایت خوبصورتی سے اسی دور کے فرد کی بے حسی کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صنعتی دور کا انسان جہاں مظلوم ہے وہیں ظالم بھی ہے، جہاں حساس ہے وہیں بے حس بھی ہے۔ مشینی دور نے اسے چلتا پھرتا اک پرزہ بنا دیا ہے۔ اس کی بے حسی اور جلد بازی کی عادت نے ایک معصوم جان کو موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اس کو اتنا وقت میسر نہیں ہے کہ وہ اس جانی نقصان پر افسوس کا اظہار کر سکے۔ مجید امجد لکھتے ہیں:

کالی بجری کے روغن میں جینے والے اس معصوم لہو کی کون سنے گا
ممتا بک بھی چکی ہے چند ٹکوں میں
قانون آنکھیں میچے ہوئے ہے
قاتل پہیے بے پہراہیں(۴)

معصوم بچے کا لہو انصاف کا طلبگار ہے لیکن قانون کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ ماں کی ممتا بھی معاشی مجبوریوں کے تحت چند سکوں کے عوض بک چکی ہے۔ وہ بچہ جس کا لہو اب ایک دھبے کی صورت اختیار کر چکا ہے اس کی فریاد سننے وار اس کو انصاف دلانے والا کوئی نہیں ہے یہاں تک کہ شاعر بھی اس کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔ وہ صرف اس کے لیے افسوس اور دکھ کا اظہار کر سکتا ہے۔

جدید دور کا فرد اپنی ہی ایجاد کردہ گاڑی میں بیٹھا فطرت سے دور ہو جانے پر افسوس کا اظہار کر رہا ہے۔ وہ جنگل کی آزاد اور بے فکری کی زندگی کو اصل زندگی سمجھتا ہے۔ جہاں ہر طرف ہریالی اور درختوں کی رونق ہے۔ یہیں فطرت اپنے اصل روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ مجید امجد جنگل کی خوبصورتی کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کچھ جنگلات اتنے گہرے اور گنجان ہوتے ہیں کہ وہاں موجود درخت دھوپ سے زمین کو محفوظ رکھتے ہیں یہاں تک کہ دن کے اجالے میں بھی رات کا سا گماں ہوتا ہے۔ یہ جنگل

Vol. 7 No.3 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

انسانوں کی پہنچ سے دور ہیں وہ ناتوشکاری کی صورت میں وہاں پہنچ سکااور ناہی وپاری کالبادہ اوڑھ کر جنگلوں کے اس سکوت کو توڑنے میں کامیاب ہو سکا ہے۔ مجید امجد نظم میں لکھتے ہیں:

م کتنے خوش نصیب ہو آزاد جنگلو!
اب تک تمہیں چھوا نہیں انساں کے ہات نے
اب تک تمہاری صبح کو دھندلا نہیں کیا
تہذیب کے نظام کی تاریک رات نے(۵)

یہاں مجید امجد دور جدید کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہتا ہے کہ صنعتی دور کا فرد تہذیب کے نام پر پابندیوں میں جھکڑا ہوا ہے۔ وہ چاہ کر بھی ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا ۔اس کے بر عکس جنگلات میں رہنے والے پرندے اور جانوران پابندیوں سے آزاد ہیں جو تہذیب کے نام پر معاشری میں رائج ہیں۔ اس حوالے سے چند مصرعے ملاحظہ کریں:

ان وسعتوں میں کلبہ وایواں کوئی نہیں
ان کنکروں میں بندہ وسلطاں کوئی نہیں(۶)

ترقی یافتہ فرد یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ جنگلوں کی تہذیب انسانوں کی بنائی گئی تہذیب سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ انسانوں کی دنیا میں امیر غریب، ظالم مظلوم جیسی تفریق ہر جگہ دیکھنے کو ملتی ہے جبکہ جنگلوں میں ایسا کوئی قانون نہیں یہاں نا کسی کے قصر وایوان سجائے جاتے ہیں اور ناہی کسی کے لیے محل تعمیر کیے جاتے ہیں۔

مجید امجد زندگی میں موجود عام اشیاء کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ اس کی خصوصیات اور تفصیلات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ مابعد الطبعاتی پہلو اور کائنات کے ساتھ ان کا تعلق بھی بیان کرتے ہیں۔ کنواں ایک ایسی چیز ہے جس سے تقریبا تمام لوگ واقف ہیں۔ شعرا اور مصنفین نے اس کے بارے میں لکھا بھی ہے مگر جب مجید امجد نے اس کو اپنا موضوع بنایا تو کنواں وقت کی عظیم علامت کی صورت میں ہمارے سامنے آشکار ہوا۔ وہ کنویں کی خارجی ساخت کو بیان کرتے ہیں اور پھر اس کو طبعی دنیا سے روشناس کراتے ہوئے مابعد الطبعاتی فضا میں لے جاتے ہیں۔ مجید امجد کی نظم کنواں کے حوالے سے "آفتاب اقبال شمیم" اپنے مضمون "مجید امجد کی شاعری: ایک جائزہ" میں لکھتے ہیں:

"کنواں "ایک ایسی نظم ہے جو اپنے فنی محاسن سے قطع نظر
موضوعی اعتبار سے شاعر کے معاشرتی، تاریخی اور کائناتی
نقطہ نظر کا کھل کر اظہار کرتی ہے۔"(۷)

یہ نظم معاشرتی کی عکاسی کرتی ہے۔ کنواں زرعی دور کے انسان کی ضرورت اور ان کی زندگیوں کا قیمتی اثاثہ تھا۔ مجید امجد نے سامنے کی ایک چیز کو نہایت خوبصورت اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ صنعتی دور کا انسان اس خوبصورتی کو دیکھنے سے محروم ہے۔ نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ کیجئے:

عدم سے ازل تک، ازل سے ابد تک، بدلتی نہیں ایک آن اس کی گردش
نہ جانے لئے اپنے دولاب کی آستینوں میں کتنے جہان اس کی گردش
رواں ہے رواں ہے
تپاں ہے تپاں ہے
یہ چکر یونہی جاوداں چل رہا ہے
"کنواں چل رہا ہے"(۸)

Vol. 7 No.3 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

مجید امجد کی اس نظم کا اطلاق معاشرتی سطح پر ہوتا ہے۔ یہاں وہ حاکم اور محکوم کے تصور کو نہایت دلکش انداز میں بیان کر رہے ہیں کہ زرعی دور کا فرد بیلوں پر اپنا حکم چلایا کرتا تھا اور اب صنعتی دور میں سرمایہ داران ہی دیہاتی زمینداروں پر اپنا حکم چلاتے ہیں۔

مجید امجد نے فطرت کو اپنی شاعری میں جا بجا استعمال کیا ہے۔ زرعی دور کا انسان فطرت کے بہت قریب تھا۔ آہستہ آہستہ ترقی ہونے لگی اور انسان نے صنعتی دور میں قدم رکھا۔ شہر بنائے جانے لگے۔ یہ شہر انسان کے فطرت سے دوری کا سبب بنے۔ ہم صنعتی دور کو مادی ترقی کا نام دے سکتے ہیں مگر یہی ترقی انسانی روح کا زوال ہے۔ شہر اپنی ہی آبادیوں کو ختم کرتے ہیں اور ان کی جگہ نئی دنیا بساتے ہیں اور اس دنیا کا انسان نا صرف احساس سے عاری ہوتا ہے بلکہ اس میں انفرادی احساس کی صلاحیت بھی تقریباً ختم ہو جاتی ہے۔ سوشل میڈیا، سیاست، ٹی وی، ریڈیو، اخبار اور کتابیں وغیرہ اسے اپنا نظریہ فراہم کرتے ہیں اس کا اپنا کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ اسی نظریے کو وہ اپنا مقدر سمجھ کر قبول کرتا ہے اور اسی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ مجید امجد کی نظم توسیع شہر انہی موضوعات کے گرد گھومتی ہے ان کی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار
جھومتے کھیتوں کی سرحد پر بانکے پہرے دار
گھنے سہانے چھاؤں چھڑکتے بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار(۹)

مجید امجد زمینی خوبصورتی کو سب سے اہم سمجھتے ہیں انہوں نے نظم میں ہرے بھرے اشجار کو کھیتوں کا پہرے دار کہا ہے۔ اشجار ہی کی وجہ سے زمین پر زندگی ممکن ہے۔ ان کا خاتمہ انسان کا خاتمہ ہے۔ مجید امجد نے کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار جیسے الفاظ کا استعمال کیا ہے جن کے ذریعے وہ بتانا چاہتے ہیں کہ صنعتی دور کا فرد فطرت سے انجان ہے اور وہ اس کے تحفظ کے لیے کوئی مثبت کردار ادا نہیں کر پا رہا بلکہ وہ درختوں کو کاٹ کر اپنی ہی موت کا سامان کر رہا ہے۔ جس طرح پیڑ کاٹے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ شہر بسائے جا رہے ہیں۔ یہ حساس طبیعت رکھنے والے فرد کے لیے افسردگی کا باعث ہیں۔ نظم کے آخری شعر میں صنعتی دور کے انسان پر گہرا طنز کیا جا رہا ہے۔ جو درختوں کو کاٹ کر قدرتی آفات کو دعوت دے رہا ہے۔ بقول مجید امجد:

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک اے آدم کی آل(۱۰)

۲۹۴۲ کا جنگی پوسٹر مجید امجد کی شاہکار نظم ہے۔ یہ نظم صنعتی دور کے انسان کی ذہنی شدت پسندی کو ظاہر کرتی ہے۔ صنعتی دور کا انسان خلائی سائنسی ترقی سے آگاہ ہے وہ سوچتا ہے کہ ایک ہزار سال بعد مریخ اور زمیں کے رہنے والوں میں جنگ ہو گی۔ سائینسی ماہرین اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ مریخ پر زندگی کے امکانات موجود ہیں۔ صنعتی دور کا فرد خیال کرتا ہے کہ مریخ کے لوگ زمیں کے باسیوں سے بہت ذہین اور ترقی میں ان سے بہت آگے ہیں۔ صنعتی دور کا فرد ترقی کا اتنا شیدائی ہو چکا ہے کہ وہ ترقی کی وجہ سے مریخ اور زمیں کے لوگوں کا موازنہ کرتا نظر آ رہا ہے۔ وہ ان کی تیز رفتار ترقی کے حوالے سے کہتا ہے کہ:

آندھیوں نے انہیں حرام دیا
بجلیوں نے انہیں نظر دی ہے
ڈوبتا سورج ان کا مغفر ہے

Vol. 7 No.3 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

شفق سرخ ان کی وردی ہے(۱۱)

"ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا"اس شعر سے متعلق اپنے مضمون "مجید امجد کا نظریہ کائنات" میں کہتے ہیں:

"مریخ سرخ سیارہ ہے دوربین سے بھی اس کا رنگ
سرخ نظر آتا ہے اس کی مناسبت سے اور ان کی
دعوت آتشیں شرر کی بنیاد پر مجید امجد نے ڈوبتے
سورج کو اہل مریخ کا مغفر اور شفق سرخ کو ان کی
وردی قرار دیا ہے جس پہ ایک تو سیارے کی رنگت کی طرف اشارہ کی
گیا ہے اور دوسری طرف اہل مریخ کی زندگی کی عظمت ظاہر کی گئی ہے۔"(۱۲)

انہوں نے یہ نظم ۱۹۴۲ء میں لکھی۔اس دور میں خلائی تحقیقات جاری وساری تھیں روسی سائنس دان خلا میں اپنا طیارہ بھیجنے کے کے لیے تگ ودو کر رہے تھے تاکہ خلا کو تسخیر کر سکیں۔دور جدید کا فرس ستاروں پر کمند ڈال رہا ہے کائنات کی وسعتوں میں موجود نئی دنیاوں کو تلاش کر رہا ہے۔مجید امجد اس حوالے سے کہتے ہیں:

"پھاند جا وحدیں زمانوں کی
تھام لو بھاگ آسمانوں کی"(۱۳)

صنعتی دور کا فرد معاشی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔اس کی زندگی مفلسی سے شروع ہو کر مفلسی پر ختم ہوتی ہے۔وہ اپنی تمام عمر اسی مفلسی کو دور کرنے کی کوشش میں گزار دیتا ہے۔مجید امجد کی نظم پنواڑی ایسے ہی مفلس فرد کی داستان حیات ہے۔جس کی آنکھوں میں زندگی کی چنگاری بجھتی جا رہی ہے۔اس کے لیے اس کی ساری دنیا وہی چھوٹی سی دکان ہے جو اس کا اور اس کے گھر والوں کا ذریعہ معاش ہے۔اس نے اپنی ساری زندگی مختلف لوگوں سے ملتے،اپنے معاشی مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے اور ایک اچھی زندگی کا خواب دیکھنے میں گزار دی ہے۔اس کے نزدیک اس کی زندگی اور دنیا بہت تلخ ہے ایسی گتھی ہے جو سلجھائے نہیں سلجھتی۔اسی گتھی کو سلجھاتے سلجھاتے وہ اس دنیا سے گزر جاتا ہے۔جس معاشی جبر سے جنگ کرتے ہوئے باپ رخصت ہو گیا اب بیٹا نے وہی ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں۔آفتاب اقبال شمیم "اپنے مضمون مجید امجد کی شاعری:ایک جائزہ میں لکھتے ہیں:

"پنواڑی،تاریخی اور معاشرتی جبر کی ایک مثال ہے،جو
نسل در نسل دکھ کی ایک ہی ڈگر پر چل رہا ہے۔"(۱۴)

پنواڑی ہمارے سماج کا وہ کردار ہے جو سرمائے کی خاطر ایک مشین کی طرح کام کر رہا ہے۔اس کی مثال ایک ایسی مشین کی سی ہے جو ہر وقت کام میں مصروف رہتی ہے اور جب بے کار ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ کوئی دوسری مشین لے لیتی ہے۔پنواڑی کا رشتہ معاش کے ساتھ ایسا ہے کہ وہ روح کے ساتھ جسم کا تعلق قائم رکھ سکے۔جسم سے روح کا تعلق قائم رکھنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ معاشی سرگرمی میں مصروف رہتا ہے۔مگر یہ معاشی سرگرمی اس کے حالات میں کوئی تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہوتی۔اس معاشی سرگرمی کا فائدہ اس کو پہنچے یا نہیں مگر صنعتی دور کے سرمایہ داروں کو ضرور پہنچتا ہے۔پنواڑی کی کہانی اکیسویں صدی کے معاشی جبر واستبداد کے شکار فرد کی نفسیات کو بیان کرتی ہے۔اسی نظم کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

"کون اس گتھی کو سلجھائے دنیا ایک پہیلی
دو دن ایک پھٹی چادر میں دکھ کی آندھی جھیلی

Vol. 7 No.3 2024
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615

دو کڑوی سانسیں لیں دو چلموں کی راکھ انڈیلی
اور پھر اس کے بعد نہ پوچھو کھیل جو ہونی کھیلی
پنواڑی کی ارتھی اٹھی باباللہ بیلی" (۱۵)

یہ نظم جدید صنعتی دور کے نظام زر میں جکڑے ہوئے فرد کی پابندیوں کو بیان کرتی ہے۔ نچلے طبقے کا فرد جان توڑ محنت کرتا ہے۔ جس کا ثمر سرمایہ دار کو کثیر سرمائے کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ نظام فرد کی آزادی کا دعوی کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جہاں عالمی بنکوں نے ترقی پذیر ممالک کو قرضوں کے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ تو وہیں غیر ملکی کمپنیوں اور بینکوں کے نت نئے حربوں نے صنعتی دور کے انسان کو اپنے جال میں کچھ ایسا جکڑا ہے کہ وہ سمجھ نہیں آتی کہ کون سا دھاگہ کس دھاگے میں الجھا ہوا ہے۔ اکیسویں صدی کا انسان اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ آزادی کی زندگی بسر کر رہا ہے مگر وہ اس بات سے لاعلم ہے کہ وہ موجودہ نظام زر میں پابہ زنجیر ہے۔

"بیڑیاں، قیدی ترے پاؤں میں ھیں تاگے نہیں
دیکھ پاپی! اپنے سر پر تیز سنگینوں کی چھت
چار سُو لوھے کی سیخوں کی فصیلِ بیکراں
تو ادھر بے دست و پا بے حس و حرکت بے سکت
اور ادھر اِس سوچ میں ھیں تیرے ظالم پاسباں
دُکھ کی کالی کوٹھڑی سے تو کہیں بھاگے نہیں
بیڑیاں، قیدی! ترے پاؤں میں ھیں تاگے نہیں"(۱۶)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مجید امجد کی نظمیں اپنے تصورات کی بنا پر منفرد ہیں۔ انہوں نے نا تو کسی کی تقلید کی ہے اور نا ہی کسی کو اپنی تقلید کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ان کی شاعری سے دردمندی جھلکتی ہے اور یہ دردمندی کسی ایک طبقے کے لیے مختص نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں حیوانات، نباتات، پھول، پھل، حشرات الارض، جمادات اور بچے سب سمٹ آتے ہیں یہاں تک کہ انہوں نے زندگی اور موت کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ مجید امجد منفرد لہجے کا شاعر ہے کیونکہ اس نے جن موضوعات کو اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے وہ جدید صنعتی دور کے ہر پہلو کو بیان کرتے ہیں۔ اس نے صنعتی دور کے انسان کی نفسیات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مجید امجد کی نظموں میں زندگی کا رس بھرا ہوا ہے۔ ان کی نظموں میں فطرت اور انسان کے رشتے کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں جنہیں وہ کہیں معصوم انداز میں اور کہیں ظالمانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1- محمد زکریا، خواجہ، کلیات مجید امجد، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۲۴، ص ۴۷
2- ایضا، ص ۷۵
3- ایضا، ص، ۴۶
4- ایضا، ص، ۴۷
5- ایضا، ص، ۷۲

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7615
Vol. 7 No.3 2024

6-ایضا، ص ۷۳
7-احتشام علی، مجید امجد نئے تناظر میں، مرتبہ، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۴، ص ۱۳۴
8- محمد زکریا، خواجہ، کلیات مجید امجد، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۲۴، ص ۵۹
9-ایضا، ص ۳۵۲
10-ایضا، ص ۳۵۳
11-ایضا، ص ۶۴
12- احتشام علی، مجید امجد نئے تناظر میں، مرتبہ، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۴، ص ۹۸
13- محمد زکریا، خواجہ، کلیات مجید امجد، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۲۴، ص ۶۵
14- احتشام علی، مجید امجد نئے تناظر میں، مرتبہ، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۴، ص ۱۳۷
15- محمد زکریا، خواجہ، کلیات مجید امجد، زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور، ۲۰۲۴، ص ۸۸
16-ایضا، ص ۲۱۵